تفسير الفاتحة

تالیف:

ڈاکٹر فہد بن بادی المرشدی

شبكة الألوكة
www.alukah.net

تفسير الفاتحة

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ١
ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٢
ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٣ مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ٤
إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ٥ ٱهۡدِنَا
ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ٦ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ
عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ٧

تفسیر الفاتحۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ سے ہی ہم مدد کے خواستگار ہیں

یہ سورۃ "فاتحۃ الکتاب" کے نام سے اس لئے موسوم ہے کیوں کہ اسی سورۃ سے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، اسی کی تلاوت سے نمازیں شروع کی جاتی ہیں، اس طرح تحریر اور تلاوت میں اس کے بعد آنے والی سورتوں کے لیے وہ نقطہ آغاز ہے۔

"ام القرآن" سے موسوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ قرآن کی تمام سورتوں پر مقدم ہے اور تلاوت وکتابت ہر دو اعتبار سے اس کے ما سوا تمام سورتیں اس کے بعد آتی ہیں۔

اسے ام القرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب لوگ ہر اس چیز کو جو دیگر چیزوں کو شامل اور مختلف اشیاء پر مقدم ہو اور متعدد امور اس کے تابع ہوں، (کہتے ہیں کہ) وہ ان تمام امور کے لیے امامِ جامع ہے۔ نبی ﷺ

نے سورۃ الفاتحہ کی آیتوں کو مثانی اس لیے کہا کہ ہر نفل اور فرض نماز میں ان آیتوں کو دہرایا جاتا ہے[1]۔

بسم اللہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ: وہ سورۃ الفاتحۃ کا حصہ ہے یا نہیں؟ اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ وہ سورۃ الفاتحہ کی آیت نہیں ہے[2]۔

بسم اللہ کے معنی یہ ہیں: میں اس تلاوت، یا دعا یا دیگر عبادت میں (بِسۡمِ ٱللَّهِ) (اللہ کے نام کے ساتھ) داخل ہو رہا ہوں، اپنی طاقت و قوت کے بل پر نہیں، بلکہ میں یہ کام اللہ کی مدد سے اور اس بزرگ و برتر کے نام سے تبرک حاصل کرتے ہوئے کر رہا ہوں[3]۔

---

(1) جامع البيان، للطبري (105/1، 107).

(2) دیکھیں: تفسير سورة الفاتحة، القسم العلمي، مؤسسة الدرر السنية (19).

(3) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (37).

تفسير الفاتحة

قرآن کی تلاوت کا آغاز کرتے ہوئے (بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ) پڑھنے کا مطلب یہ ہے: اللہ کے نام سے آغاز کرتے ہوئے میں پڑھتا ہوں، یا اپنی تلاوت کا آغاز اللہ کے نام سے کرتا ہوں، اس کا معنی یہ ہوا کہ: میں اللہ کے نام اور اس کے ذکر کے ساتھ پڑھ رہا ہوں اور اللہ کے نام اور اس کے خوبصورت اسمائے گرامی اور بلند وبالا صفات کے ساتھ تلاوت کا آغاز کر رہا ہوں [4]۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ: (بِسۡمِ ٱللَّهِ) کے معنی ہیں: اللہ تعالی کے تمام اسماء سے میں آغاز کر رہا ہوں، کیوں کہ لفظ (اسم) واحد اور مضاف ہے، اس لیے تمام اسمائے حسنی کو شامل ہے [5]۔

---

(4) جامع البيان، للطبري (115/1، 116).
(5) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

اللہ تعالی کے فرمان: (ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ) کا معنی

کلامِ عرب میں الحمد کے معنی ہوتے ہیں: کامل حمد وثنا(6) ، لیکن حمد اور ثنا میں فرق ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ عزیز وبرتر حدیث قدسی میں فرماتا ہے: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی ہے اور میرے بندے نے جو مانگا، اس کا ہے۔ جب بندہ (ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ) ”سب تعریف اللہ ہی کے لیے جو جہانوں کا رب ہے،، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ اور جب وہ کہتا ہے: (ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ) ”سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہمیشہ مہربانی کرنے والا،، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے

---

(6) الجامع لأحكام القرآن، للقرطبي (205/1).

میری ثنابیان کی۔ پھر جب وہ کہتا ہے: (مَٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ)"جزا کے دن کا مالک"، تو (اللہ) فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ پہلے فرمایا: (میرے بندے نے میری تعریف کی)، پھر فرمایا: (میرے بندے نے میری ثنابیان کی)۔ چنانچہ ثنا کا مطلب ہے: دوبارہ حمد بیان کرنا، حمد ایک جنس ہے اور ثنا اسے دہرانے کا نام ہے، جبکہ: تمجید کہتے ہیں: ان اوصاف کا ذکر کرنا جو بذات خود عظیم وبرتر ہوں، یہ دونوں (ثنا اور تمجید) کثرت سے حمد کرنے کے معنی میں ہیں۔ البتہ ثنا (حمد کی) اس کثرت کو کہتے ہیں جس سے مراد کمیت ہوتی ہے، اور تمجید (حمد کی) اس کثرت کو کہتے ہیں جس سے مراد کیفیت ہوتی ہے[7]۔ بنابریں حمد کے معنی ہیں: محبت اور تعظیم کے ساتھ زبان سے اللہ کی ثنابیان کرنا، حمد اس وقت تک حمد نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس میں ثنا کے ساتھ محبت

---

(7) تفسير الفاتحة، لا بن رجب (70، 92).

وتعظیم شامل نہ ہوں، ورنہ لفظ ثنا، حمد سے زیادہ خاص معنی کا حامل ہے، اسی لیے سابقہ حدیث میں ثنا کو حمد پر عطف کیا گیا ہے، جو کہ خاص کو عام پر عطف کرنے کے قبیل سے ہے، اس طرح حمد کے اندر ثنا کا معنی اور اس کے علاوہ اضافی معنی بھی پایا جاتا ہے۔ محبت اور تعظیم کے ساتھ اللہ کے خوبصورت ناموں، بلند وبالا صفات اور ان افعال کے ذریعہ اللہ کی ثنا بیان کرنا جو محض فضل واحسان، اور عدل وحکمت پر مبنی ہیں، یہ سب محامد کی وہ قسمیں ہیں جن کے ذریعہ اللہ عزیز وبرتر کی حمد کی جاتی ہے[(8)]۔

مفسرین اس موقع پر حمد اور شکر میں فرق بیان کرتے ہیں، کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ: حمد دراصل شکر ہی کے معنی میں ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: حمد کے معنی ہیں: نعمتوں پر شکر بجالانا، اس طرح حمد اور شکر ہم معنی

(8) تفسیر الفاتحة، صالح بن عبدالعزیز آل الشيخ.

الفاظ ہیں، کیوں کہ عربوں کی زبان سے واقفیت رہنے والے تمام لوگ حمد اور شکر کو ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال کرتے ہیں، اس طور پر (اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ) کے معنی ہیں: ہر طرح کا شکر خالص اللہ کے لیے ہے، اس کے سوا جتنے معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے، ان کے لیے نہیں اور نہ اللہ کے پیدا کردہ مخلوقات کے لیے، اسی معنی کو ابن جریر نے راجح قرار دیا ہے[9]۔

جبکہ کچھ مفسرین دونوں میں فرق کرتے ہیں، اس سلسلے میں سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ: حمد کے معنی ہیں زبان سے ممدوح کی صفات بیان کرکے اس کی تعریف کی جائے، اور شکر یہ ہے کہ منعم و محسن کی تعظیم کی جائے۔ چنانچہ شکر تعظیم کا نام ہے جس کا سبب نعمت ہوتی ہے، اور اسے دل، زبان اور اعضاء وجوارح سے ادا کیا جاتا ہے۔ جبکہ حمد دل اور زبان

(9) جامع البيان، للطبري (135/1).

سے ادا کی جاتی ہے، کیوں کہ اس سے مراد ثنا بیان کرنا ہے[10]۔ معلوم ہوا کہ حمد سے مراد: ممدوح کی تعریف بیان کرنا ہے اور اس میں شکر بھی شامل ہوتا ہے، البتہ ان دونوں میں فرق ہے[11]، یہ تفریق بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے متاخرین علماء کے نزدیک یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ حمد کا مطلب ہے: ممدوح کی لازم و متعدی صفات کے ذریعہ زبان سے اس کی ثنا بیان کی جائے۔ جب کہ شکر صرف متعدی صفات پر ہی کیا جاتا ہے، اور یہ دل، زبان اور اعضاء و جوارح سے ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان عموم اور خصوص کا تعلق ہے، چنانچہ حمد اور شکر جس وجہ سے ادا کیے جاتے ہیں، **اس کے اعتبار سے حمد، شکر سے زیادہ عام ہے**، کیوں کہ حمد لازم اور متعدی ہر

---

(10) تفسير القرآن، عبدالرحمن بن ناصر البراك.

(11) زاد المسير، لابن الجوزي (33).

قسم کی صفات پر کی جاتی ہے، جبکہ شکر صرف متعدی صفات پر کیا جاتا ہے، اور حمد و شکر جس کے ذریعہ سے ادا کیے جاتے ہیں، **اس کے اعتبار سے شکر زیادہ عام ہے**، کیوں کہ شکر قول و عمل اور نیت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، جبکہ حمد صرف قول سے کی جاتی ہے[12]۔ **اس طرح ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ**: حمد کے اندر ممدوح کی تعریف و ثنا شامل ہوتی ہے، بایں طور کہ اس کے محاسن اور خوبیوں کو ذکر کیا جائے، خواہ وہ ثناخواں کا محسن ہو یا نہ ہو، جبکہ شکر صرف محسن کا ہی ادا کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حمد، شکر سے زیادہ عام ہے، کیوں حمد محاسن اور احسان دونوں پر کی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی ہے اس کے اسمائے حسنی پر بھی اور ان چیزوں (نعمتوں) پر بھی جو اس نے دنیا

(12) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (128/1).

وآخرت میں پیدا کیا ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ [الإسراء:111]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے۔

نیز فرمایا: ﴿ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ﴾ [الأنعام:1]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

جبکہ شکر صرف انعام واکرام پر بھی ہی ادا کیا جاتا ہے، اس اعتبار سے یہ حمد سے زیادہ خاص ہے، لیکن شکر دل، ہاتھ اور زبان ہر ایک سے ادا کیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿ٱعْمَلُوٓا۟ ءَالَ دَاوُۥدَ شُكْرًا﴾ [سبأ:13]

ترجمہ: اے آل داود! اس کے شکریہ میں نیک عمل کرو۔

جبکہ حمد صرف دل اور زبان سے کی جاتی ہے، حمد کے معنی ہیں: زبان سے ثنا بیان کرنا۔ زبان کی قید نے اس فعل کو (حمد کے دائرہ سے) باہر کر دیا جسے زبان حال کہا جاتا ہے۔ جو کہ شکر کی ایک قسم ہے۔ اس طرح شکر اپنی اقسام کے اعتبار زیادہ عام ہے اور حمد اپنے اسباب کے اعتبار سے زیادہ عام[13]۔ چنانچہ حمد کہتے ہیں: جو صفات ممدوح کے اندر ہیں، ان پر اس کی تعریف کرنا، اور شکر کہتے ہیں: جو احسان وانعام اس سے صادر ہو، اس پر اس کی تعریف کرنا۔ اس لیے حمد بطور تعریف وثنا کے ابتدائے امر میں بھی کی جا سکتی ہے، جبکہ شکر صرف نعمت کے مقابلہ میں ہی ادا کیا جاتا ہے[14]۔

---

(13) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (38)؛ وتفسير الفاتحة، لا بن رجب (70).

(14) زاد المسير، لابن الجوزي (33).

تحقیق یہ ہے کہ: حمد کا مطلب ہے ممدوح کی خوبصورت صفات سے راضی ہونا اور زبان سے اس کی خبر دینا، اس طرح وہ: محبت اور رضا مندی کے ساتھ ممدوح کے محاسن کی خبر دیناہے(15)۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کے محاسن کی خبر دے، لیکن ان محاسن سے محبت نہ کرے تو وہ حامد اور ثناخواں نہیں کہلائے گا، اور اگر ان محاسن سے محبت کرے اور اس کی خبر نہ دے تو بھی وہ حامد اور ثناخواں نہیں کہلائے گا(16)۔ حمد یہ ہے کہ محبت اور تعظیم کے ساتھ ممدوح کو کمال سے متصف کیا جائے، کیوں کہ بغیر محبت اور تعظیم کے ممدوح کو کمال سے متصف کرنے کا نام حمد نہیں ہے بلکہ اس کا نام مدح ہے(17)۔ معلوم ہوا کہ حمد کا مطلب ہے

(15) تفسير الفاتحة، لا بن رجب (71).
(16) مجموع الفتاوى ٨/ ٣٧٨، (259/6).
(17) تفسير القرآن الكريم (الفاتحة-البقرة)، لابن عثيمين (9/1).

کہ: کامل صفات اور ان افعال کے ذریعہ اللہ کی تعریف وثنا بیان کی جائے جن کا تعلق اس کے فضل واحسان اور عدل وانصاف سے ہے اور جو حکمت تامہ پر مشتمل ہیں، ثناخواں کی حمد خوانی اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے جب اس کی حمد میں اپنے رب کی محبت اور اس کے تئیں عاجزی وانکساری کا جذبہ شامل ہو، کیوں کہ محبت اور عاجزی سے عاری تعریف وثنا کو کامل حمد نہیں کہا جاسکتا(18)۔

الحمد میں جو الف لام ہے وہ حمد کی تمام اجناس واقسام کو اللہ تعالی کے لیے خاص کرنے کے معنی میں ہے(19)، چنانچہ الحمد پر الف لام داخل ہونے کا معنی یہ ہے کہ: ہر طرح کی حمد وثنا اور کامل شکر اللہ تعالی ہی کے لیے ہے۔ اگر الف لام حذف کردیے جائیں تو اس کا معنی صرف یہ رہ جائے

---

(18) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).
(19) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (131/1).

گا کہ تمام قسم کی حمد وثنا کے بجائے صرف اس قائل کی حمد وثنا اللہ کے لیے ہے[20]۔اسے معرفہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حمد کی تمام قسمیں شامل ہیں، وہ تمام قسم کی حمد وثنا پاک پروردگار کے ساتھ خاص ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے علاوہ کسی اور کی حمد وثنا کا کوئی اعتبار نہیں، کیوں کہ منعم ومحسن تو اللہ عزیز وبرتر ہی ہے، یا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی حمد وثنا ہی کامل وشامل ہے، اس معنی میں حصر ادعائی (مجازی) ہو گا[21]۔

اللہ کے فرمان: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کا معنی ہے: حمد وثنا اللہ کے لیے ثابت اور قائم ہے[22]، اس حمد وثنا کے ذریعہ اللہ نے اپنی ذات کی تعریف

---

(20) جامع البيان، للطبري (1/138).
(21) فتح البيان، للقنوجي (42).
(22) زاد المسير، لابن الجوزي (33).

کی ہے، اور اسی ضمن میں بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی حمد وثنا کریں، گویا کہ اللہ نے فرمایا: تم سب کہو: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ)، معلوم ہوا کہ اللہ جلّ شانہ نے اپنی ذات کی کما حقہ حمد وثنا بیان کی، پھر اپنے بندوں کو اس کی تعلیم دی، اور ان کی آزمائش کے طور پر ان پر اس کی تلاوت کو فرض کر دیا، اللہ نے ان سے کہا: کہو: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ)[23]، اللہ کے یہ الفاظ خبر دینے والے الفاظ ہیں، لیکن وہ حکم کے معنی میں ہیں، پوشیدہ عبارت یوں ہے: کہو: الحمد للہ (تمام تعریفات اللہ کے لیے ہیں)[24]۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ اپنی حمد وثنا کر رہا ہے اور ہمیں بھی یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی حمد وثنا بیان کریں، چنانچہ اللہ کا یہ فرمان جس میں اللہ اپنی ذات کی حمد وثنا کر رہا ہے، اگر مسلمان اس آیت کی

---

(23) جامع البيان، للطبري (139/1).

(24) زاد المسير، لابن الجوزي (33).

تلاوت کرے تو یہ اس کی جانب سے اس کے پروردگار کی حمد وثنا ہوگی[25]۔

محققین کے نزدیک لفظ (اللہ) اللہ تعالی کا اسم اعظم (سب سے بڑا نام) ہے، کیوں کہ تمام صفات سے اس اسم کو متصف کیا جاتا ہے، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں دو ہزار تین سو ساٹھ (۲۳۶۰) مقامات پر اس نام کو ذکر کریا ہے[26] ، یہ اللہ تبارک و تعالی کا علَم (اسم) ہے، جو کہ حقیقی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، یہ اللہ تعالی کے تمام اسمائے گرامی میں سب سے خاص اسم ہے، اللہ پاک کے سوا کسی کو اس سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔

---

(25) تفسير القرآن، عبدالرحمن بن ناصر البراك.

(26) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (122/1)؛ وفتح البيان، للقنوجي (41).

رہی بات اللہ تعالی کے نام (اللہ) کے معنی کی تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: وہ ذات جس کی عبادت ہر ایک شی اور ہر ایک مخلوق کرتی ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی: (وَيَذَرَكَ وَإِلَاهَتَكَ) ، اور فرمایا: (اس آیت میں إلاهَتَك کے معنی ہیں) "عبادتک"۔ نیز فرمایا: "فرعون کی پرستش کی جاتی تھی لیکن وہ خود عبادت نہیں کرتا تھا"۔ چنانچہ ابن عباس کی تفسیر کے مطابق الِالاھۃ مصدر ہے، جیسے کوئی کہے: ألَه اللهَ فلانٌ إلاهةً، اس کا معنی وہی ہے جو اس جملہ کا ہے: عَبَد اللهَ فلانٌ عبادةً. (یعنی: فلاں نے اللہ کی عبادت کی)۔ ابن عباس کے اس قول سے یہ واضح ہو گیا کہ: "ألَه" کے معنی ہیں: اس نے عبادت کی۔ اور "الِالاھۃ" اسی فعل کا مصدر ہے[27]، چنانچہ (اللہ) کے معنی ہیں: وہ معبود جو ہر قسم کی عبادت

---

(27) جامع البيان، للطبري (122/1).

کا تن تنہا مستحق ہے، کیوں کہ وہ الوہیت کی تمام صفات سے متصف ہے[28]۔

جب آپ یہ جان چکے کہ (اللہ) کا معنی الإلہ ہے اور الإلہ کا معنی معبود کے ہے، اس کے بعد آپ اللہ کو پکاریں، یا اس کے نام پر جانور ذبح کریں، یا اس کے لیے نذر مانیں، تو (آپ یہ ساری عبادتیں یہ جانتے ہوئے انجام دیں گے کہ) وہی اللہ ہے، اور اگر آپ کسی مخلوق کو پکاریں، یا اس کے نام پر ذبح کریں، یا اس کے لیے نذر مانیں تو گویا آپ یہ دعوی کر رہے ہیں کہ وہ اللہ ہے[29]۔

---

(28) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

(29) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (42).

اللہ کے فرمان: (رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) کا معنی ومفہوم

عربوں کی زبان میں رب کے مختلف معانی ہیں: وہ آقا جس کی اطاعت کی جاتی ہو، اسے عربوں میں رب کہا جاتا ہے۔ چیزوں کو درست کرنے والا بھی رب کہلاتا ہے، کسی چیز کا مالک بھی اس کا رب کہلاتا ہے۔ ہمارا جلیل الشان پروردگار: وہ آقا ہے جس کے مثل کوئی نہیں، اس کی سرداری میں کوئی اس کا ہمسر نہیں، اپنی مخلوقات کے معاملات کو درست کرنے والا ہے، بایں طور کہ ان پر اپنے انعامات کرتا ہے، وہ مالک ہے جو پیدا کرتا اور حکم دیتا ہے[30]۔ رب سے مراد وہ ذات ہے: جو مالک ہو اور تصرف پر قادر ہو، لغت میں اس کا اطلاق آقا وسردار اور اصلاح کرنے

(30) جامع البيان، للطبري (143/1).

والے مصلح پر بھی ہوتا ہے، اللہ تعالی کے حق میں یہ تمام معانی درست ہیں۔ اضافت کے بغیر رب کا استعمال اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں، لیکن اضافت کے ساتھ اس کا استعمال جائز ہے، مثلا آپ کہیں: ربُّ الدار (گھر کا مالک)، ربُّ کذا (فلاں چیز کا مالک)، البتہ الرّبُّ کا اطلاق اللہ عزیز وبرتر کے لیے ہی کیا جا سکتا ہے، ایک قول کے مطابق: یہ اسم اعظم ہے(31)، چنانچہ رب وہ ہے: جس میں تین صفتیں موجود ہوں: تخلیق، ملکیت اور تدبیر، معلوم ہوا کہ رب وہ ہے جو ہر چیز کا خالق ومالک اور تمام امور کی تدبیر کرنے والا ہے(32)۔

---

(31) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (131/1).

(32) تفسير القرآن الكريم (الفاتحة- البقرة)، لابن عثيمين (9/1).

اللہ کے فرمان: ﴿ٱلْعَـٰلَمِينَ﴾ کی تفسیر یہ ہے کہ: (العالَمون) عالَم کی جمع ہے، اور عالَم ایسی جمع ہے جس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا، یہ مختلف قسم کی اقوام و ملل کا نام ہے[33] اور آسمان وزمین میں رہنے والی نوع بنوع کی مخلوقات بھی اس نام میں شامل ہیں۔ چنانچہ اللہ عزیز وبرتر کے سوا تمام موجودات اس سے مراد ہیں۔ اللہ بزرگ وبرتر کے علاوہ جتنی بھی موجودات ہیں، سب اس نام کے تحت آتی ہیں، لہذا اللہ کے سوا جتنے بھی فرشتے، انبیا، انسان اور جنات وغیرہ ہیں، وہ سب (اپنے رب کے) ماتحت اور اس کے قہر وغلبہ سے مغلوب ہیں، (وہ پالنہار) ان کے اندر تصرف کرتا ہے[34]۔ یہ قول تمام اقوال سے زیادہ صحیح ہے کیوں کہ

---

(33) جامع البيان، للطبري (144/1).

(34) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (41).

اس میں تمام مخلوقات وموجودات شامل ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:

﴿ قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٢٣ قَالَ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَآۖ ﴾ [الشعراء:23][35].

ترجمہ: فرعون نے کہا رب العالمین کیا (چیز) ہے؟ (حضرت) موسی (علیہ السلام) نے فرمایا وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ: (العالَم) کا اطلاق مفرد کے طور پر نہیں بلکہ کسی جنس کی طرف اضافت کے ساتھ ہی ہوتا ہے، جو اسے خاص کر دیتا ہے،

---

(35) الجامع لأحكام القرآن، للقرطبي (214/1).

جیسے کہا جاتا ہے: عالَم الانس، عالَم الحیوان اور عالَم النبات، اللہ تعالی کے سوا کسی اور کے مجموعی وجود کے لیے یہ لفظ بطور اسم مستعمل نہیں ہے، یہی لغوی تحقیق ہے، کیوں کہ عربوں کے کلام میں عالَم کا اطلاق اللہ کے سوا کسی اور کے مجموعی وجود کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا استعمال علمائے منطق نے اپنے اس قول میں کیا ہے: (العالَم حادث) جو کہ ایک اصطلاح ہے[36]۔

اللہ کے فرمان: (ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ) کے معنی یہ ہیں کہ: جلال وکمال کی صفات پر مشتمل حمد وثنا کی جتنی بھی قسمیں ہو سکتی ہیں، وہ سب صرف ایک اللہ کے لیے زیبا ہیں، کسی اور کے لیے نہیں، کیوں کہ

(36) التحرير والتنوير، لابن عاشور (168/1).

وہی تمام چیزوں کا پالنہار، خالق اور مدبر ہے[37]۔ معلوم ہوا کہ (رَبِّ الْعَٰلَمِينَ) اسم الجلالۃ (اللہ) کی صفت ہے۔ بایں طور کہ اللہ نے جب اپنی بلند وبرتر ذات کے اسم گرامی کی طرف حمد وثنا منسوب کی جس کا مقصد (حمد وثنا کے) استحقاق ذاتی سے متنبہ کرنا ہے، تو اس کے بعد الرَّب کے ذریعہ اپنی صفت بیان کی تاکہ حمد کا تعلق اس سے بھی قائم ہو جائے، اور یہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالی کی صفت بھی حمد وثنا کا استحقاق رکھتی ہے جس طرح اس کی ذات اس کا استحقاق رکھتی ہے، اس مقصد کے لیے چار اوصاف کا ذکر فرمایا: رب العالمین، الرحمن، الرحیم، مالک یوم الدین، تاکہ صفت کا استحقاق ظاہر ہو سکے، کیوں کہ صفات پر

(37) المختصر في تفسير القرآن الكريم (1).

دلالت کرنے والے ان اسمائے گرامی کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اصلی معانی پر توجہ دی جائے[38]۔

(38) التحرير والتنوير، لابن عاشور (166/1).

اللہ تعالی کے فرمان: ﴿ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ﴾ کا معنی ومفہوم

﴿ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ﴾: یہ اللہ تعالی کے دو اسمائے گرامی ہیں، جو کہ اللہ تعالی کی عظمت وجلال کے شایان شان صفت رحمت کے اثبات کو شامل ہیں، یہ دونوں اسماء اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالی کشادہ اور عظیم رحمت والا ہے جس کی رحمت ہر ایک چیز کو محیط اور ہر جاندار کو شامل ہے، اللہ نے اپنے انبیاء ورسل کی پیروی کرنے والے متقی بندوں کے لیے رحمت کامل لکھ دی ہے، ان کے لیے مطلق اور کامل رحمت ہے، لہذا ﴿ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ﴾ کے معنی ہیں: اس عظیم رحمت کا مالک جس سے وہ متصف ہے اور جس کا تعلق رحم کیے جانے والے سے ہے۔ تمام تر نعمتیں اللہ کی رحمت کے آثار ہیں [39]، یہ دونوں اسماء رحمت سے مشتق

---

(39) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

ہیں، لیکن ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ بلیغ معانی کا حامل ہے، العلّام اور العلیم کی طرح[40]، چنانچہ رحمن کے اندر، رحیم کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، کیوں کہ رحمن کے معنی ہیں: ایسی رحمت والا جس کی رحمت بے نظیر ہے، عربوں کے کلام میں (فعلان) کا وزن مبالغہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ وہ لبالب بھری ہوئی چیز کو: ملآن کہتے ہیں اور انتہائی شکم سیر شخص کو: شبعان کہتے ہیں[41]، یہ بھی مقرّر بات ہے کہ وزن میں (حروف) کی زیادتی معنی میں اضافہ پر دلالت کرتی ہے[42]۔ معلوم ہوا کہ رحمن، رحمت کی صفت مبالغہ ہے، جس کا معنی ہے کہ وہ انتہائی درجے کا مہربان ہے، جیسے سکران اور غضبان انتہائی

---

(40) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (37).

(41) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (124/1).

(42) فتح القدير، للشوكاني (15).

درجے کے (خمار اور غصہ) پر دلالت کرتے ہیں۔ رحمن ایک ایسی صفت ہے جو اللہ کے ساتھ خاص ہے اور انسان پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا، وہ فعیل کے وزن سے زیادہ بلیغ ہے، اور فعیل کا وزن فاعل کے وزن سے زیادہ بلیغ ہے، کیوں کہ راحم اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے رحم کیا، خواہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ کیا ہو، جبکہ رحیم اس شخص کو کہا جاتا ہے جس سے بکثرت صفت رحمت کا صدور ہوتا ہو اور رحمن منتہائے رحمت کے لیے استعمال ہوتا ہے[43]۔

ان دونوں اسماء میں تفریق کی بابت مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

پہلا قول: رحمن: ایک ایسا اسم ہے جو رحمت کی تمام قسموں کو شامل ہے، اور یہ اللہ تعالی کے لیے خاص ہے، جبکہ رحیم کا تعلق مومنوں سے

(43) المحرر الوجيز، لابن عطية (38).

ہے [44]۔ اللہ کا اسم گرامی الرّحمن عمومی رحمت پر دلالت کرتا ہے، جبکہ اس کا اسم گرامی الرّحیم خصوصی رحمت پر دلالت کرتا ہے[45]۔ معلوم ہوا کہ (ٱلرَّحۡمَٰنِ) کے معنی ہیں: ایسی عمومی رحمت کا مالک جس کی رحمت تمام مخلوقات کی روزی اور مفادات کو شامل اور مومن وکافر سب کے لیے عام ہے۔ جبکہ (ٱلرَّحِيمِ) مومنوں کے لیے خاص ہے[46]۔

دوسرا قول: (ٱلرَّحۡمَٰنِ) سے مراد وہ ذات ہے جس کی رحمت دنیا وآخرت دونوں جہان میں عام ہے، اور (ٱلرَّحۡمَٰنِ) سے مراد وہ ذات ہے جس کی

---

(44) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (125/1).
(45) تفسير القرآن، عبدالرحمن بن ناصر البراك.
(46) زاد المسير، لابن الجوزي (32).

رحمت آخرت میں مومنوں کے ساتھ خاص ہوگی[47]۔ چنانچہ رحمن وہ ہے جس کی رحمت دنیا میں تمام مخلوقات کے لیے عام ہے اور آخرت میں مومنوں کو حاصل ہوگی، اور الرحیم وہ ہے جس کی رحمت قیامت کے دن مومنوں کے لیے خاص ہوگی، اکثر علماء اسی معنی کے قائل ہیں[48]۔ معلوم ہوا کہ رحمن کے اندر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے کیوں کہ وہ دنیا وآخرت میں اللہ کی تمام مخلوقات کے لیے عام ہے، اور الرحیم مومنوں کے ساتھ خاص ہے، لیکن دعائے ماثور میں آیا ہے: (رحمن الدنيا والآخرة ورحيمهما)[49]۔ اگر یہ اعتراض آئے کہ: آپ نے جو تفصیل بتائی ہے اس میں اور اس ماثور دعا میں جو وارد ہوا ہے، اس میں

(47) تفسير الفاتحة، لا بن رجب (76).
(48) أضواء البيان، للشنقيطي (48/1).
(49) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (126/1).

تطبیق کیسے ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا—واللہ اعلم- کہ الرّحیم مومنوں کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، لیکن یہ صرف آخرت میں ہی ان کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ ان کو دنیا میں بھی یہ رحمت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ **رحیمھما** کا معنی یہ ہوا کہ: دنیا وآخرت ہر جگہ اس کی رحمت مومنوں کے ساتھ خاص ہے[50]۔

تیسرا قول: الرحمن وہ ہے جس کے اندر رحمت قائم ہے، اور الرحیم وہ ہے جو دوسرے کو رحمت سے نوازتا ہے[51]، چنانچہ بسم اللہ اور سورۃ الفاتحہ میں اور اللہ تعالی کے فرمان﴿هُوَ ٱلرَّحۡمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ﴾ [البقرۃ:163] میں الرحمن کا الرحیم کے ساتھ یکجا استعمال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ: الرحمن اس رحمت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ کی صفت

(50) أضواء البيان، للشنقيطي (48/1).
(51) تفسير الفاتحة، لا بن رجب (86).

ذاتی ہے اور اس کی پاک ذات میں قائم ہے، اور الرحیم اس رحمت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ عزیز وبرتر کی صفت فعلی ہے اور جو (مرحوم) رحم کیے جانے والے سے متعلق ہے، چنانچہ وہ بزرگ وبرتر (اللہ) رحم کرنے والا اور اپنی مشیت سے اپنے (منتخب) بندوں کو رحمت سے سرفراز کرنے والا ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلا اسم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رحمت اللہ کی صفت ہے اور دوسرا اسم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق پر رحم کرتا ہے، اگر آپ اسے اور بہتر انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں تو اللہ کے اس فرمان پر غور کریں: (وَكَانَ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ رَحِيمٗا) [الأحزاب:43]

ترجمہ: اور اللہ تعالی مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے۔

نیز اس فرمان پر بھی غو رکریں: (إِنَّهُۥ بِهِمۡ رَءُوفٞ رَّحِيمٞ) [التوبة:117]

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی مشفق ومہربان ہے۔

کہیں بھی رحمن بِھم کی تعبیر استعمال نہیں ہوئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الرحمن سے مراد وہ ذات ہے جو رحمت سے متصف ہے اور رحیم سے مراد وہ ذات ہے جو اپنی رحمت نچھاور کرتی ہے[52]۔ چنانچہ ان دونوں اسماء میں تفریق کی بابت سب سے عمدہ اور درست ترین قول یہ ہے کہ: الرحمن رحمت کی ذاتی صفت کو شامل ہے، اور الرحیم رحمت کی فعلی صفت کو شامل ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ: رحمن بالمؤمنین (یعنی: رحمن کی رحمت مومنوں کے ساتھ خاص ہے)، بلکہ وہ رحمن الدنیا والآخرۃ (رحمن کی رحمت دنیا وآخرت میں تمام مخلوقات کو شامل ہے)[53]، بنابریں (ٱلرَّحۡمَٰنِ) وہ ہے: جو وسیع وکشادہ رحمت کا

---

(52) بدائع الفوائد، لابن القيم (24/1)، ومدارج السالكين (75/1).

(53) تفسير القرآن، عبدالرحمن بن ناصر البراك.

مالک ہے، اسی لیے یہ "فَعلان" کے وزن پر آیا ہے، جو کشادگی پر دلالت کرتا ہے، اور (ٱلرَّحِيمِ) وہ ہے: جو حاصل ہونے والی رحمت کا مالک ہے، یعنی وہ: اپنی مشیت سے (منتخب) بندوں کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے، اسی لیے یہ "فعیل" کے وزن پر آیا ہے جو فعل کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، لہذا ایک رحمت اس کی صفت ہے جس پر (ٱلرَّحۡمَٰنِ) دلالت کرتا ہے، اور ایک رحمت اس کا فعل ہے، یعنی مرحوم تک رحمت پہنچانا، اس معنی پر (ٱلرَّحِيمِ) دلالت کرتا ہے[54]۔ معلوم ہوا کہ (ٱلرَّحۡمَٰنِ) وہ ہے جو اپنی ذات میں الرحمن (رحمت سے متصف) ہے اور (ٱلرَّحِيمِ) وہ

(54) تفسير القرآن الكريم (الفاتحة)، لابن عثيمين (1/5).

ہے جو اپنی رحمت کے ذریعہ اپنی مشیت کے مطابق اپنی مخلوق پر رحم کرتا ہے، جن میں اس کے مومن بندے بھی شامل ہیں[55]۔

(ٱلرَّحۡمَٰنِ) اور (ٱلرَّحِيمِ) کے مابین فرق بیان کرنے سے متعلق جو اقوال وارد ہوئے ہیں ان کی توجیہ ابن جریر نے یہ بیان کی ہے کہ وہ تمام اقوال باہم مختلف ہونے کے باوجود درست ہیں، ساتھ ہی آپ نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالی دنیاوآخرت ہر دو جگہ اپنی تمام مخلوقات کے تئیں رحمن (مہربان) ہے، اور ساتھ ہی وہ دنیا وآخرت میں رحیم (مہربان) بھی ہے۔ لیکن یہ رحمت اس کے مومن بندوں کے ساتھ خاص ہے[56]۔ چنانچہ الرحمن اور الرحیم دونوں ہی اسم رحمت سے مشتق ہیں، البتہ اللہ کو الرحمن سے موسوم کرنے کا جو معنی ہے وہ الرحیم

---

(55) المختصر في تفسير القرآن الكريم (1).

(56) موسوعة التفسير بالمأثور (21/2).

سے موسوم کرنے میں نہیں ہے، وہ یہ کہ: الرحمن سے موسوم کرنے کا مطلب ہے کہ وہ تمام مخلوقات کے تئیں عمومی رحمت سے متصف ہے، اور الرحیم سے متصف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بعض مخلوقات کے تئیں خصوصی رحمت سے متصف ہے، یا تو تمام حالات میں ، یا بعض حالات میں، ہمارا عظیم الشان پروردگار دنیا وآخرت میں تمام مخلوقات کے تئیں رحمن ہے (مہربان) اور دنیا وآخرت میں مومنوں کے تئیں رحیم (مہربان) ہے۔ اللہ نے مومنوں کو دنیا وآخرت میں خصوصی رحمت سے سرفراز کیا ہے، ساتھ ہی انہیں اور ان کے ساتھ کافروں کو بھی دنیا میں عمومی رحمت سے نوازا بایں طور کہ ان سب پر احسان کیا، کشادہ رزق عطا کیا، بادل کو بارش کے لیے مسخر کردیا، زمین سے پودے اگائے، جسمانی اور دماغی صحت سے نوازا اور ان بے شمار نعمتوں سے سرفراز کیا جن سے مومن وکافر سب لطف اندوز ہو رہے ہیں، اللہ کی یہ

وہ عمومی رحمت ہے جو دنیا میں تمام مخلوقات کو حاصل ہوتی ہے، چنانچہ اس رحمت کے ذریعہ اللہ تعالی ان سب کے تئیں رحمن (مہربان) ہے، رہی بات آخرت کی تو اس کی جو رحمت تمام مخلوقات کو شامل ہے، ان کے لیے (آخرت میں بھی) وہ رحمن (مہربان) ہوگا: بایں طور کہ اللہ جلّ شانہ اپنے عدل اور فیصلہ میں ان کے درمیان برابری کرے گا، ان میں سے کسی پر بھی ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا، اگر نیکی ہوگی تو اس (کا اجر وثواب) بڑھا چڑھا کر دے گا اور ہر نفس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ عنایت کرے گا، آخرت میں تمام مخلوقات کے تئیں اللہ کی عمومی رحمت کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان پر اس رحمت کے ذریعہ مہربانی کرے گا جس کے ذریعہ دنیا میں ان پر (رحمن) مہربان تھا، رہی بات مومنوں کے تئیں دنیا میں اس کی خصوصی رحمت کی تو اس سے مراد وہ رحمت

ہے جس کے ذریعہ وہ دنیا میں مومنوں کے تئیں رحیم (مہربان) تھا، جیسا کہ اللہ جلّ شانہ کا فرمان ہے: ﴿وَكَانَ بِٱلْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالی مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے۔

اللہ جلّ شانہ نے اپنے مومن بندوں کو دنیا میں خصوصی رحمت سے سرفراز کیا، بایں معنی کہ اپنے لطف ومہربانی سے انہیں اپنی اطاعت کی توفیق دی، اپنی ذات پر اور اپنے رسولوں پر ایمان لانے کی توفیق دی، اپنے حکم کو بجالانے اور اپنی نافرمانیوں سے بچنے کی توفیق دی، انہیں اس خصوصی رحمت (توفیق) سے نوازا، برخلاف کافروں کے جنہیں اللہ نے رسوا کیا، رہی بات آخرت میں مومنوں کے تئیں اللہ کی خصوصی رحمت کی تو (اس سے مراد یہ ہے کہ) وہ کافروں کے بجائے خاص ان مومنوں پر رحم فرمائے گا، بایں طور کہ انہیں ان نعمتوں اور کرامتوں سے

نوازے گا جو اللہ نے صرف ان کے لیے تیار کیا ہے اور جن کی ہم تمنا بھی نہیں کر سکتے (57)۔

(57) جامع البيان، للطبري (127/1).

اللہ تعالی کے فرمان (مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ) کا معنی ومفہوم

(مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ) :اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی ملکیت رکھتا ہے اور اس معاملہ میں وہ منفرد ہے، کوئی بھی مخلوق اس میں شریک نہیں، (الدین) سے مراد حساب وکتاب اور اجر وثواب ہے[58]۔ اللہ پاک تن تنہا قیامت کے دن کا مالک ہے، جو کہ اعمال کے جزاوسزا کا دن ہے[59]۔

قیامت کے دن کے ساتھ ملکیت کو خاص کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالی اس کے سوا دیگر ایام کا مالک نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالی دونوں جہاں کا پالنہار ہے، جو کہ دنیا وآخرت دونوں جہان کے لیے عام ہے۔ قیامت کے دن کی طرف اس ملکیت کی اضافت اس

(58) جامع البيان، للطبري (152/1).
(59) التفسير الميسر (1).

لیے کی گئی ہے کیوں کہ اس دن کوئی کسی چیز کا دعوی نہیں کرے گا اور نہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی زبان کھول سکے گا (60)۔ چنانچہ قیامت کے دن کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ، جب کہ اللہ تعالی تمام دنوں کا مالک ہے، یہ ہے کہ اس دن ہر قسم کی ملکیت زائل ہو جائے گی، اور اللہ کے علاوہ نہ کسی کی ملکیت ہوگی اور نہ حکم چلے گا، فرمان باری تعالی ہے: ﴿ ٱلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ ٱلْحَقُّ لِلرَّحْمَٰنِ ﴾ [الفرقان: ٢٦]

ترجمہ: اس دن صحیح طور پر ملک صرف رحمن کا ہی ہوگا (61)۔

اس دن مخلوق کے سامنے اللہ کی ملکیت کا کمال اور اس کے عدل وحکمت کا جلال پورے طور پر ظاہر ہوگا اور مخلوق کی تمام تر ملکیت کا زوال نمایاں ہوگا، یہاں تک کہ اس دن شاہ وگدا، حاکم ومحکوم اور غلام وآزاد سب

---

(60) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (134/1).

(61) معالم التنزيل، للبغوي (10).

ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے، سب کے سب رب کی عظمت کے سامنے سر نگوں ہوں گے، اس کے اجر وثواب کی امید لیے کھڑے ہوں گے اور اس کی سزا سے خائف وہراساں ہوں گے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس دن کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ وہ تو قیامت کے دن کے ساتھ دیگر تمام ایام کا مالک ہے(62)۔

چونکہ اللہ تعالی نے اپنی ذات کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ دونوں جہان کا پالنہار اور رحمن ورحیم (مہربان) ہے، اس لئے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالی سارے جہان میں اپنے بندوں پر مہربان ہے اور کائنات میں اور حالات واطوار پر اللہ کے جو تصرفات ظاہر ہوتے ہیں، ان پر غور کرنے والا سمجھ سکتا ہے کہ وہ سارے تصرفات رحمت پر مبنی

(62) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

ہوتے ہیں، ان تصرفات میں امر و نہی (حکم دینے اور منع کرنے کے تصرفات) بھی ہیں جنہیں شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس مقام کا تقاضہ تھا کہ جزا کے دن وہ (شارع) فیصل وحاکم کے طور پر نمودار ہو، کیوں کہ کام پر جزا وسزا کے مرتب ہونے سے فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے(63)۔

یہ آیتیں ان اوصاف پر مشتمل ہیں جن سے اللہ پاک متصف ہے، جیسے یہ کہ اللہ تعالی سارے جہان کا پالنہار ہے، مخلوق کو وجود بخشنے والا، ان پر انعام واکرام کرنے والا ہے اور جزا وسزا کے دن سارے معاملات اسی کی ملکیت میں ہوں گے(64)، جہاں کسی کو کسی چیز کی ملکیت حاصل نہ ہوگی، چنانچہ جو شخص مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے اللہ کو

---

(63) التحرير والتنوير، لابن عاشور (173/1).

(64) فتح البيان، للقنوجي (47).

پکارے، پھر اسی مقصد کے لیے کسی مخلوق کو بھی پکارے، تاکہ یہ مخلوق اسے خیر و بھلائی عطا کرے اور شر و فساد سے بچالے، جبکہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ گردانتا ہو، اللہ کی ربوبیت کا اقرار بھی کرتا ہو، تو ایسا شخص (اپنے عمل سے) یہ اقرار نہیں کرتا کہ (اللہ تعالی) تمام جہانوں کا پالنہار ہے، بلکہ (اس کے اس عمل سے) اللہ کی بعض ربوبیت کا انکار کرتا ہے، جو شخص اس آیت کی تفسیر سے واقف ہو اور یہ جان لے کہ (کس وجہ سے) ملکیت کو اس دن کے ساتھ خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے، جب کہ اللہ پاک اس دن اور اس کے علاوہ تمام دنوں میں ہر ایک چیز کا مالک ہے، تو وہ یہ جان لے گا کہ خصوصیت کے ساتھ اس عظیم مسئلہ کا ذکر کرنا (اتنا اہم ہے کہ) اسے جاننے کی وجہ سے کچھ لوگ جنت میں داخل ہوں گے جبکہ کچھ لوگ اس سے ناآشنائی کی وجہ سے جہنم واصل ہوں گے۔

یہ معنی و مفہوم دیکھیے اور قرآن کی وضاحت و صراحت پر غور کیجئے اور سر دُھنیے کہ قصیدۃ البردۃ کا شاعر (اپنے اشعار میں) ان معانی و مفاہیم سے کس قدر دور بھٹکا ہوا ہے؟ کیا کسی بندہ کے دل میں ان اشعار کی تصدیق اور اللہ کے اس فرمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث کی تصدیق ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہے: ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ﴾ [الإنفطار:19]

ترجمہ: (وہ ہے) جس دن کوئی شخص کسی شخص کے لئے کسی چیز کا مختار نہ ہو گا اور (تمام تر) احکام اس روز اللہ کے ہی ہوں گے۔

"اے فاطمہ بنت محمد! میں اللہ کی طرف سے کسی چیز کو تم سے دور نہیں کر سکوں گا"۔

اللہ کی قسم، یہ دونوں تصدیق ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، یہ تو ایسے ہی ہو گا کہ اس کے دل میں موسی بھی سچے ہوں اور فرعون بھی سچا ہو، محمد بھی سچے اور برحق ہوں اور ابو جہل بھی سچا اور برحق ہو(65)۔

(65) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (44).

اللہ تعالی کے فرمان: (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) کا معنی ومفہوم

(إِيَّاكَ نَعْبُدُ) کے معنی یہ ہیں کہ: ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، فعل پر مفعول کو مقدم کیا گیا ہے تاکہ حصر کا معنی دے، اور (نَعْبُدُ) کے معنی یہ ہیں کہ: ہم تیرے سامنے نہایت عاجزی وانکساری اختیار کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مومن اپنے جسم کے سب سے اشرف وافضل عضو کو قدم کی جگہ (روئے زمین) پر رکھتے ہیں، تاکہ اللہ عزیز وبرتر کے سامنے عاجزی کا اظہار کرسکیں، چنانچہ اس کی پیشانی مٹی سے بھر جاتی ہے، اس سب کا مقصد صرف اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کرنا ہوتا ہے، (العبد) سے مراد وہ بندہ ہے جو شرعی مقصود ومراد میں معبود کے مطابق چلے، بنابریں (عبادت) کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان تمام اوامر پر عمل پیرا ہو

اور ہر قسم کی منہیات سے دامن کش رہے، اور اس عمل کو اللہ کی مدد کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا(66)۔

معلوم ہوا کہ (إِيَّاكَ نَعْبُدُ) کے معنی یہ ہیں: صرف تیرے ہی سامنے ہم نہایت درجے کی عاجزی اور خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں، تجھ سے محبت رکھتے، تیری ہی تعظیم بجالاتے اور تجھ سے ہی خوف کھاتے ہیں (67)۔یعنی: تجھے ایک مانتے اور تیری وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے: آپ اپنے پروردگار سے یہ عہد وپیمان کرتے ہیں کہ آپ

---

(66) تفسير القرآن الكريم (الفاتحة)، لابن عثيمين (13/1).
(67) اللباب في تفسير الاستعاذة والبسملة وفاتحة الكتاب، د. سليمان بن إبراهيم اللاحم (253).

اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، نہ کسی قریبی فرشتہ کو، نہ کسی نبی مرسل کو اور نہ ان کے علاوہ کسی اور کو(68)۔

فرمان الٰہی: (وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) کے معنی ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ سے ہی اس بات پر مدد طلب کرتے ہیں کہ ہم تیری عبادت کریں اور تمام تر معاملات میں تیری ہی اطاعت کریں، تیرے سوا کسی اور کی پیروی نہ کریں، جب تیرے ساتھ کفر کرنے والا اپنے معاملات میں اپنے اس صنم اور بت سے مدد طلب کرتا ہے جسے وہ تجھ سے روگردانی کرتے ہوئے پوج رہا ہوتا ہے، تو ہم (اس کے بالمقابل) اپنے تمام معاملات میں تجھ سے مدد طلب کرتے اور تیرے ہی لیے ہر قسم کی عبادت کو خالص رکھتے ہیں(69)۔

---

(68) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (50).

(69) جامع البيان، للطبري (160/1).

چنانچہ فرمان باری تعالی: (إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ) کا مطلب یہ ہے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہر قسم کی عبادت اور مدد طلبی کو ہم تیرے ہی لئے خاص کرتے ہیں، چنانچہ تیرے سوا نہ کسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ کسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہ در اصل بندے کا اپنے رب کی بندگی پر قائم رہنا اور اس بندگی کو بجا لانے میں اپنے پروردگار سے مدد کی دعا کرنا ہے[70]۔ مفعول کو مقدم کرنے اور تکرار کے ساتھ اسے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ: اس کی اہمیت ظاہر ہو اور حصر کا معنی ادا ہو۔ یعنی: ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ پر ہی توکل کرتے ہیں، اور یہی کمالِ اطاعت ہے، جس کی طرف مذکورہ دونوں معانی لوٹتے ہیں، پہلے جملہ میں شرک سے براءت کا اظہار ہے، اور دوسرے جملہ میں ہر قسم کی طاقت و قوت سے براءت کا اظہار اور تمام

---

(70) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

ترمعاملات کو اللہ عزوجل کے سپرد کرنے کا مظہر ہے، اس معنی کو قرآن کی مختلف آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے: (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ) [هُودٍ:١٢٣]

ترجمہ: مجھے اسی کی عبادت کرنی چاہیئے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اور تم جو کچھ کرتے ہو، اس سے اللہ تعالی بے خبر نہیں۔

(قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا) [الْمُلْك:٢٩][71]

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ وہی رحمن ہے ہم تو اس پر ایمان لا چکے، اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے۔

(71) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (134/1).

(إِيَّاكَ نَعْبُدُ) کے بعد (وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) کو ذکر کرنے میں یہ معنی مضمر ہے کہ: توکل اور بھروسہ اسی پر کرنا چاہیے جو عبادت کا مستحق ہے، کیوں کہ تمام تر اختیارات و معاملات صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں[72]۔

(72) أضواء البيان، للشنقيطي (50/1).

اللہ کے فرمان: ﴿ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ﴾ کا معنی ومفہوم

"الصراط" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان تمام اقوال کا نچوڑ ایک ہی ہے، اور وہ ہے اللہ ورسول کی پیروی، ایک قول ہے کہ: اس سے مراد قرآن ہے، دوسرا قول ہے: اسلام، تیسرا قول ہے: حق، یہ تمام اقوال درست ہیں اور ایک معنی سے دوسرا معنی لازم آتا ہے(73)۔ اللہ کے فرمان: ﴿ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ﴾ کا مطلب ہے: ہماری رہنمائی فرما اور راہ دکھا، اور ہمیں راہ مستقیم کی توفیق عطا فرما۔ اس میں صراط مستقیم کی ہدایت بھی شامل ہے۔ جس سے مراد: دین اسلام کو لازم پکڑنے اور اس کے ماسوا تمام ادیان سے دامن کش رہنے کی توفیق ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ: راہ مستقیم پر چلتے

---

(73) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (137/1).

ہوئے علم و عمل ہر دو اعتبار سے ہدایت کی توفیق دے[74]۔یعنی: ہمیں اس قول و عمل پر ثابت قدم رہنے کی توفیق دے جسے تو نے پسند کیا اور جس کی تو نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو توفیق دی، یہی صراط مستقیم ہے۔ اللہ نے اسے استقامت سے اس لئے متصف کیا ہے کہ وہ درست راستہ ہے، اس میں کوئی کجی اور کمی نہیں[75]۔ اس طور پر ﴿ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ﴾ کے معنی یہ ہوں گے: ہمارے لئے اس راہ کو واضح کر دے اور ہمیں صراط مستقیم کی راہنمائی فرما، ہمیں توفیق، ہدایت وراستی اور ثابت قدمی عطا فرما[76]۔جب اللہ پاک وبرتر جس سے دعا وسوال کیا جا

(74) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).
(75) جامع البيان، للطبري (1/171، 176).
(76) اللباب في تفسير الاستعاذة والبسملة وفاتحة الكتاب، د. سليمان بن إبراهيم اللاحم (271).

رہا ہے، کی حمد وثنا ہو چکی، تو مناسب تھا کہ اس کے بعد سوال اور دعا کا ذکر ہو[77]۔ لہذا اس واضح اور صریح دعا کو ذکر کیا گیا جو کہ اللہ کی جانب سے بندہ کو ملنے والی نوازش اور نصیبہ ہے، یعنی خشوع وانابت اور الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا کرنا کہ اسے یہ عظیم نعمت عطا کرے، جس سے افضل نوازش دنیا وآخرت میں کسی کو نہیں دی گئی[78]۔ یہ ایک نہایت جامع اور بے حد مفید دعا ہے، اس لیے انسان پر واجب کیا گیا ہے کہ ہر رکعت میں یہ دعا کرے، کیوں کہ اسے اس کی سخت ضرورت ہے[79]۔

---

(77) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (136/1).
(78) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (51).
(79) تيسير الكريم الرحمن، للسعدي (27).

مومن ہدایت پر قائم ہونے کے باوجود یہ دعا اس لیے کرتے ہیں تاکہ: ان کو ثابت قدمی عطا ہو۔ یعنی وہ مزید ہدایت کی دعا کرتے ہیں[80]۔

اس میں یہ وضاحت بھی ہے کہ بندہ کو سعادت اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ صراط مستقیم پر ثابت قدم رہے اور وہ اس راہ پر اسی وقت ثابت قدم رہ سکتا ہے جب اس کا پرودگار اسے اس کی ہدایت عطا کرے، اسی طرح وہ اسی وقت اللہ کی عبادت کر سکتا ہے جب اللہ کی مدد اس کے شامل حال رہے[81]۔

---

(80) معالم التنزيل، للبغوي (10).

(81) الفوائد، لا بن القيم (19).

اللہ کے فرمان: ﴿صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ کا معنی ومفہوم

یہ آیت صراط مستقیم کا معنی واضح کرتی ہے کہ اس سے مراد کونسا راستہ ہے؟ یہ صراط مستقیم کی تفسیر ہے[82]۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے (صحیح معنی کی) تاکید اور وضاحت وصراحت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ صراط مستقیم کی تفسیر ہے اور (اس میں) یہ وضاحت ہے کہ اس سے مراد ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر انعام کیا گیا[83]۔ چنانچہ (الصراط المستقیم) کے بدل کے طور پر ﴿صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ کا ذکر ایک

---

(82) جامع البيان، للطبري (176/1).

(83) اللباب في تفسير الاستعاذة والبسملة وفاتحة الكتاب، د. سليمان بن إبراهيم اللاحم (280).

انوکھے معنی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: ہدایت ایک نعمت ہے اور جن پر کامل نعمت کی گئی وہ صراط مستقیم کے راہ رو ہیں[84] ۔

اللہ کے فرمان: ﴿أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ: تونے ان پر ہدایت اور توفیق کے ذریعہ احسان کیا[85]۔ یعنی: ہمیں اپنے ان بندوں کی راہ پر چلا جن پر تونے اپنی ہدایت کا انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں[86]۔ ﴿ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ نساء کی اس آیت میں ہوا ہے: ﴿وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ فَأُوْلَٰٓئِكَ مَعَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ

---

(84) التحرير والتنوير، لابن عاشور (194/1).
(85) معالم التنزيل، للبغوي (10).
(86) المختصر في تفسير القرآن الكريم (1).

وَٱلصِّدِّيقِينَ وَٱلشُّهَدَآءِ وَٱلصَّٰلِحِينَۚ وَحَسُنَ أُوْلَٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴾ [النِّسَاءِ: ٦٩] (87).

ترجمہ: اور جو بھی اللہ تعالی کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالی نے انعام کیاہے، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔

---

(87) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (140/1).

اللہ تعالی کے فرمان: (غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ) کا معنی ومفہوم

جمہور (غَيْرِ) کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس معنی میں کہ وہ (ما قبل کی) صفت ہے[88]۔ اس طرح (غیر) اسم موصول (الذی) کی صفت واقع ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ نعمت مطلقہ یعنی ایمان اور غضب وگمراہی سے سلامتی سے یکساں طور پر متصف تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ: (غیر) اس موصول کا بدل ہے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ انعام یافتہ لوگ وہ ہیں جو غضب اور گمراہی سے محفوظ ہیں۔ تقدیری عبارت یہ ہوگی: غير صراط المغضوب عليهم[89]۔ اس کا معنی یہ ہوگا: ہمیں

(88) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (140/1).

(89) اللباب في تفسير الاستعاذة والبسملة وفاتحة الكتاب، د. سليمان بن إبراهيم اللاحم (286).

صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما، جو کہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام کیا اور جن کی صفت گزر چکی ہے۔ نہ کہ ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا غضب نازل ہوا یعنی وہ لوگ جن کے ارادے میں بگاڑ پیدا ہو گیا، چنانچہ حق شناسی کے بعد بھی وہ اس سے منحرف رہے، اور نہ ان لوگوں کے راستے پر چلا جو گمراہ ہو گئے۔ یعنی وہ لوگ جو علم سے نابلد رہے، انجام کار گمراہی (کی تاریکی) میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور حق کی ہدایت سے محروم ہیں [90]۔ یعنی ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان لوگوں کی راہ پر چلا جو ہدایت سے گمراہ ہیں [91]۔

---

(90) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (140/1).

(91) معالم التنزيل، للبغوي (11).

(غَيْرِ) میں ایک قراءت نصب کے ساتھ ہے، راء پر نصب کی دو قسمیں ہیں: حال کے طور پر، جس کے معنی یہ ہیں: انعام یافتہ لوگوں کا راستہ، اس حال میں کہ نہ ان پر غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ یا دوسری قسم: استثناء کے طور پر: گویا آپ نے یہ کہا ہو کہ: سوائے ان کے جن پر تیرا غضب نازل ہوا[92]۔ اس کی تفسیر اور قراءت کے تعلق سے ہمارے نزدیک درست رائے یہ ہے کہ (غَيْرِ ٱلْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ) میں (غَيْرِ) کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے، اس اعتبار سے کہ وہ (ٱلَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) کی صفت ہے۔ جب ہم (غَيْرِ ٱلْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ) کو (ٱلَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) کی صفت مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ: اللہ نے چونکہ ان کی یہ صفات بتائی ہے کہ وہ

---

(92) المحرر الوجيز، لابن عطية (46)، وتفسير الفاتحة، لا بن رجب (139).

اللہ کی توفیق وہدایت سے بہرہ ور اور اس کے دینی انعامات سے سرفراز ہیں، اس لیے ان پر نہ تو اللہ کا غضب نازل ہوگا اور نہ وہ گمراہ ہونے والے ہیں[93]۔

اللہ تعالی کے فرمان: ﴿غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ﴾ سے مراد: یہودی اور ہر وہ شخص ہے جو حق کو جاننے کے بعد اس پر عمل نہ کرے۔ اور اللہ کے فرمان: ﴿وَلَا ٱلضَّآلِّينَ﴾ سے مراد: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کے نصاری اور ہر وہ شخص ہے جو حق کو جانے بغیر باطل پر عمل کرنے لگے[94]۔ چنانچہ وہ لوگ جن پر غضب نازل ہوا: ایسے علماء ہیں جنہوں نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا۔ اور گمراہ ہونے لوگ وہ ہیں: جو

---

(93) جامع البيان، للطبري (182/1، 185).

(94) تفسير القرآن الكريم (الفاتحة - البقرة)، لابن عثيمين (17/1).

بغیر علم کے عمل کرتے ہیں، پہلی صفت یہودیوں کی اور دوسری صفت نصرانیوں کی ہے۔

بہت سے لوگ جب تفسیر میں یہ پڑھتے ہیں کہ یہودیوں پر غضب نازل ہوا اور نصاری گمراہ ہوئے، تو یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ یہ صفتیں صرف ان کے لیے ہی خاص ہیں، جبکہ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پروردگار نے ان پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ یہ دعا کریں اور ان صفات کے حاملین کی راہ پر چلنے سے پناہ مانگیں، سبحان اللہ! (تعجب کی بات ہے کہ کیسے اللہ تعالی انہیں اس کی تعلیم دے، ان کے لیے اس دعا کو منتخب کرے، ان پر ہمیشہ یہ دعا مانگنا فرض قرار دے، اور وہ اس گمان میں مبتلا رہیں کہ انہیں ان صفات سے متنبہ رہنے کی ضرورت نہیں، اور نہ وہ یہ

تصور کریں کہ وہ بھی اس گناہ کا مرتکب ہو سکتے ہیں، یہ اللہ کے تئیں بد گمانی رکھنا ہے(95)۔

لہذا اس کے معنی یہ ہیں کہ: ہمیں انعام یافتہ بندوں کی راہ پر چلنے کی توفیق دے جیسے نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگوں کی راہ۔ یہ حضرات ہدایت اور استقامت سے بہرہ ور تھے، ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ کر جو ان لوگوں کی راہ پر چل پڑے جن پر غضب نازل ہوا، یعنی جنہوں نے حق جاننے کے بعد بھی اس پر عمل نہیں کیا، اور وہ یہود اور ان کے نقش پا کی پیروی کرنے والے لوگ ہیں، نیز ہمیں گمراہ لوگوں میں بھی شامل نہ کر، یعنی جو اپنی جہالت کی وجہ سے ہدایت سے محروم رہے، چنانچہ راہ حق سے بھٹک گئے، اور وہ نصاریٰ اور ان کے طریقے پر چلنے والے لوگ

(95) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (54).

ہیں[96]۔کلام کی تاکید کے طور پر (وَلَا ٱلضَّآلِّينَ) میں (لا) کا استعمال کیا، تاکہ یہ تاکیدی اسلوب دو فاسد راہوں پر دلالت کر سکے، جو کہ یہود ونصاری کے راستے ہیں[97]۔ اس میں یہ وضاحت بھی شامل ہے کہ صراط مستقیم سے انحراف کے دو کنارے کیا ہیں، انحراف کا ایک چھور گمراہی کی طرف اور اس کا دوسرا چھور غضب کی طرف لے جاتا ہے[98]۔

اس آیت میں مخلوق کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: جن پر انعام کیا گیا، جن پر غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ ہر شخص یا تو اللہ تعالی کے مشروع کردہ حق سے واقف اور اس کا پیروکار ہو گا، یا اس سے واقف

(96) التفسير الميسر (1).
(97) تفسير القرآن العظيم، لابن كثير (140/1).
(98) الفوائد، لا بن القيم (19).

ہو گا لیکن اس کا پیروکار نہ ہو گا، یا اس سے نہ واقف ہو گا اور نہ اس کا پیروکار ہو گا، چنانچہ پہلی قسم سے مراد وہ لوگ ہیں: جن پر انعام کیا گیا، دوسری قسم سے مراد وہ ہیں: جن پر غضب نازل ہوا، اور تیسری قسم سے مراد: گمراہ لوگ ہیں(99)۔

صراط مستقیم سے مراد: حق سے واقف ہونا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ جنھوں نے حق کو جانا اور اس پر عمل کیا وہ وہی لوگ ہیں جن پر انعام نازل ہوا، جیسے نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ۔

دوسری قسم: جنھوں نے حق کو جانا لیکن اس سے روگردانی اور سرکشی کی، اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ کبر وغرور کا مظاہرہ کیا، یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر غضب نازل ہوا، خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ اس کے مستحق یہود ہیں۔

---

(99) تفسير الفاتحة، لا بن رجب (129).

تیسری قسم: جو حق سے نابلد رہے اور بغیر علم کے عمل کرتے رہے، یہی لوگ گمراہ ہونے والے ہیں ، تمام فرقوں میں خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ اس کے مستحق نصاری ہیں[100]۔

(آمین) سورۃ الفاتحہ کا حصہ نہیں ہے، بلکہ دعا کی قبولیت کے لیے آیا ہے، اس کے معنی ہیں: "اے اللہ! قبول فرما"، جاہلوں کو اس کی تعلیم دینا واجب ہے تاکہ وہ اس گمان میں نہ رہیں کہ (آمین) بھی اللہ عزیز وبرتر کا کلام ہے[101]۔

---

(100) تفسير القرآن، عبدالرحمن بن ناصر البراك.

(101) تفسير الفاتحة، محمد بن عبدالوهاب (55)؛ والجامع لأحكام القرآن، للقرطبي (1/197).